بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہماری بڑی مشکل یہ ہے کہ قوم کے سیاسی بزرگ زیادہ زور اس پہ دے رہے ہیں کہ "انتخابات جلد ہونے چاہئیں" —— اور ان کا کہنا غلط بھی نہیں ہے۔ دوسری طرف صاحبِ اقتدار قوت ہے وہ کہتی ہے کہ "انتخابات سے مثبت نتائج حاصل ہونے چاہئیں"۔ بات یہ بھی درست ہے۔ مگر ایک عرصہ کی بیان بازی اور ردّ و کدّ کے باوجود دونوں طاقتیں معمولی فاصلے پر کھڑی ہونے کے باوصف اپنے اپنے قدم ذرا سے آگے بڑھا کر ایک خطِ اتحاد پہ جمع نہیں ہو سکیں۔

فوجی قوت جب بھی آتی ہے تو وہ اصلاح و تعمیر کے اعلان کے ساتھ آتی ہے، مگر اصلاح و تعمیر کا ٹائم ٹیبل بڑھتا جاتا ہے۔ منزل مسافر کے آگے آگے دوڑتی رہتی ہے اور اصلاح و تعمیر کا ہونا تو کجا اُلٹا صدہا اُلجھنیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں کہ ایک دن آتا ہے، جب فوجی قوت بے تاب ہو جاتی ہے کہ جلد سے جلد الوداعی سلیوٹ کرے، مگر امن امان اور عزت آبرو سے سلیوٹ کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اب آہستہ آہستہ وہ لمحہ قریب ہو رہا ہے جب "مسکرا کر سلیوٹ کرنا" مشکل ہو جائے گا۔ اس سے پہلے جو تھوڑی سی مہلت ہے اس میں سیاست کے بند دروازوں کو کھولنے اور سیاسی عناصر کو مطمئن کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ نقطۂ نظر بھی مثبت نظر رکھنے والے تعمیر پسند سیاست دانوں اور اُن کے ہم نوا جمہور کا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو نہ فوج سے عناد رکھتے ہیں اور نہ جمہور کی پریشانی سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں۔

مگر مشکل یہ ہے کہ اُدھر والے حضرات سیاسی دلچسپیاں رکھنے والوں کا بہترین خیر خواہانہ اشارہ بھی تو نہیں مانتے۔ جیسے انہیں اپنے سوا اور کسی پر اعتماد ہی نہ ہو، حتیٰ کہ عالمی تاریخ تو کیا، خود پاکستان میں مارشل لا اور جمہوریت کے تصادم کے گذشتہ احوال و نتائج پر بھی بھروسہ نہیں ہے۔ جیسے ان کے اپنے خیال و تاثرات کے سوا سب کچھ خود غرضانہ جھوٹ نہیں تو کم سے کم بزدلانہ وہم ضرور ہو۔ ان کا سرمایۂ اعتماد ۲۱، ۲۲ گریڈ کے سیکرٹریوں اور اُن کی فائیلوں سے بھری الماریاں، سی آئی ڈی کی رپورٹیں اور فوجی کونسل کے شرکاء کا تدبر ہے۔ اور فی الحقیقت یہی وہ قوت ہے کہ جو مارشل لا کے کسی اچھے پروگرام کو بھی نہیں چلنے دیتی۔ اب تک جو مارشل لا آئے وہ سیاست دانوں کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے رہے۔ فوج کی آہنی قوت بھی بیوروکریسی کو اپنا محسن ہی سمجھتی رہی۔

دوسری طرف یہ مصیبت بھی کچھ کم قابلِ توجہ نہیں کہ جمہوریت جب بھی بحال ہوتی ہے اور پارلیمانی نظام کام کرنے لگتا ہے تو شر و فساد کے اور ہی دروازے کھل جاتے ہیں۔ اہلِ سیاست میں ایک تو بندگانِ مفاد گھسے ہوتے ہیں، دوسرے اصول و کردار کا فاقہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ اتحاد نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو کسی اعلیٰ نصب العین اور اُصول کے لیے نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ جب ٹوٹتا ہے تو جادۂ حیات کے راہ گیروں کے پاؤں کو چھیدنے والی مسائل کی کرچیاں ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔

آج کئی چھوٹے چھوٹے گروہ اپنا اپنا جھنڈا اُٹھائے موجود ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے الگ تھلگ۔ ان کے پاس یا تو اعلیٰ نظریات و مقاصد نہیں اور یا صلاحیتِ ربط و ائتلاف نہیں، کہ یہ برسوں سے بکھرے پڑے ہیں ـــــ ذرا غور کریں، کس میں کتنا شعور ہے، کتنا نظم ہے، کتنا کردار ہے، کتنی خدمات ہیں۔ اور پھر کتنی رواداری ہے؟ یہ خوبیاں نہ ہوں تو اتحاد کیسے عمل میں آئے گا۔ انتخابات کیا گل کھلائیں گے اور جمہوریت کیا رنگ دکھائے گی۔

دراصل ہمارے یہاں جمہوریت کا کوئی ایسا معیاری دَور کبھی قائم ہی نہیں ہوا جسے سامنے رکھ کر ہم سوچیں کہ وہاں تک ہمیں جانا ہے۔ "آخر شب" "جب بسمل کی تڑپ" "دید کے قابل" ہوتی، اُس وقت بھی ہمیں ایک ایسی جمہوریت نصیب ہوئی جس کے انڈوں کے سینے کا کام

مارشل لاء کی قوت ہی نے کیا تھا۔ اور پھر اس جمہوریت کے چوزوں نے "انسانیت" کو وہ تگنی کا ناچ نچایا کہ خلقِ خدا تراہ تراہ کر اٹھی۔ نوبت بایں جا رسید کہ جمہوریت کے ملبوس میں اس فسطائیت نے لوگوں کو سرے سے جمہوریت کے نام ہی سے بیزار کر دیا۔ اور لوگ یوں سوچنے لگے کہ ـــــ چوہا لنڈورا ہی بھلا!

ہماری گذارش تو یہی ہے کہ ہمارے اکابر انتخابات کرائیں، جلد کرائیں اور صلح سلامتی کی فضا میں کرائیں تاکہ نظام کے تسلسل کو برقرار رکھا جا سکے۔ اور دو قوتیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے ٹکر کا راستہ اختیار نہ کر لیں۔

بہرحال دیر کیجیے یا سویر، فضا کو ٹھنڈا رکھیے یا لوگوں کو گرما گرمی پیدا کرنے کا موقع دیجیے، محبت و آشتی کی فضا میں محفل آرائی کیجیے یا حرف و صوت میں تیزی پیدا کیجیے، انتخابات کا انعقاد تو اب لازمی ہے۔ بچ کے نکلنے کی کوئی راہ نہیں اور نہ زیادہ ٹال مٹول کا موقع باقی ہے، کیونکہ تاخیر و التوا کی ہر وجہ رہے سہے اعتماد کو ختم کر دے گی۔ اب تو تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ مستقبل کے وعدہ و اعلان کو گھسیٹ کر پیچھے لایا جائے۔ گردشِ ایام کو تھوڑا سا پیچھے دوڑا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔

کاش کہ ایسا ہوتا کہ جہاں کچھ باتیں ڈھانچے اور وعدے کی شکل میں تھیں، وہاں کوئی نہ کوئی اقدام نقد انقد بھی لوگوں کی توقع سے پہلے کر دیا جاتا۔ مثلاً اس اعلان سے کوئی بڑا فرق واقع نہ ہوتا کہ آج سے پارٹیاں بحال کی جاتی ہیں اور وہ فی الحال بند کمروں کی پابندی کے ساتھ اپنے تنظیمی، مشاورتی اور انتخابی وظائف انجام دے سکتی ہیں۔ اگر بروقت یہ واقعہ رونما ہو جاتا تو نہ صرف اس کا نشہ لوگوں میں اچھا خاصا کام کرتا، بلکہ آئندہ کے لیے ان کی قوتِ امید و اعتماد مضبوط ہو جاتی۔ یا یہ فیصلہ سنا دیا جاتا کہ ۱۹۸۴ء میں ہم سارے انتخابات نمٹا دیں گے۔

کیا ہی اچھا موقع تھا کہ ربیع الاوّل کا مہینہ آیا تھا، اس کی ۱۲ کو خاص پیغام میں

صدر صاحب کوئی نئی بات قوم سے کہتے جس سے عوام کا اعتماد بحال ہو جاتا۔

اب فوجی اور سیاسی دونوں قوتیں اس حقیقت پر غور کریں کہ جمہوریت اور انتخابات کو چلانے میں جس کم سے کم درجے کا معاشرہ کامیاب ہو سکتا ہے، آج شاید ہم اصلاحی و تعمیری مقاصد کے لحاظ سے حالات کو اس سے بھی زیادہ مشکل پائیں۔

اخلاقی تخریب کا زہر ہماری رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔ ہم میں اپنی پہچان اور شناخت کم ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اقبال کے اشعار قوالوں کے حوالے ہو گئے ہیں۔ دفتر بہ دفتر اور محکمہ بہ محکمہ رشوت، سفارش کام کر رہی ہے۔ چیزوں میں ملاوٹ ہے۔ گلیوں اور سڑکوں بلکہ گھروں میں گندگی پھیلی ملتی ہے۔ انکم ٹیکس، کسٹم، ریلوے، پولیس، تعلیم گاہیں، امتحانی مراکز، بلدیاتی کونسلیں، کارپوریشنیں، احاطۂ عدالت، جیل خانے، مخلوط مجالسِ تفریح، اخلاق بگاڑ کھیل تماشے، ——— آپ جدھر جائیں بگاڑ کا ایک طوفان اُمڈ رہا ہے۔ گنتی کے لوگ ان دائروں میں امانت و دیانت کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ مگر وہ بھی بگڑے ہوئے ساتھیوں اور ماتحتوں کو تلقینِ اصلاح کرنے کے بجائے اُلٹا اپنے وجود کے عاجزانہ (PASSIVE) تحفظ میں عمریں گذار دیتے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی فیصلہ کن لمحہ تصادم آجاتا ہے تو سرے سے استعفیٰ دے کر خانہ نشیں ہو جاتے ہیں۔

ایسے معاشرے سے آپ کو دین سے محبت، ملک کی تعمیر اور عوام کی خدمت کو اصول بنانے والی قوت برآمد کرنی ہے۔ کوئی ایسا طریقہ سوچنا ہے کہ اس معاشرے کے ووٹوں سے آپ اُس قلیل التعداد عنصر کو حاصل کر لیں جو ایمان و شرافت بھی رکھتا ہے، بصیرت و لیاقت بھی، اور سرگرمِ عمل بھی۔

آئندہ انتخابات کے سلسلے میں چند اصولی باتیں ہو جائیں تو اچھا ہے۔

انتخابات پُرتکدر فضا پیدا ہونے سے پہلے ہونے چاہئیں، لہٰذا ان کے پہلے دور کے لیے مارچ ۱۹۸۴ء

کا اچھا تھا ورنہ دو ایک ماہ اور التوا ہو سکتا ہے۔

تاخیر سے بے اعتمادی بڑھے گی، بے اعتمادی کو بارود بنا کر تخریبی قوتیں استعمال کریں گی۔ پاکستان کے مفاد میں ان قوتوں کو پچھلے طور طریقوں سے روکنا پڑے گا، نتیجہ کشمکش — اور پھر اگر کوئی بات ہو گی تو پُرتکدر فضا میں ہو گی۔ پُرتکدر فضا میں کسی کا بھی ذہنی توازن بجا نہیں رہتا۔ ہر کوئی انتہا پسند بن جاتا ہے، ہر کسی کی سعی ہوتی ہے کہ وہ پہلے پہ دہلا مارے۔ اس مرحلے میں حکمران اور عوام (اور ان کے جو بھی لیڈر میدان میں ہوں) ایک دوسرے کے حریف بن کر بحران کا حل سوچتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم ایک نئے بحران میں داخل ہو جاتی ہے۔

انتخابات کے لیے صاف ستھری فضا اور ہنستے مسکراتے چہروں کی ضرورت یوں بھی ہے کہ پچھلے دور اور آئندہ دور میں کوئی صورت تسلسل پیدا کرنی ہے۔ یہ ضرورت شہریوں، سیاسی جماعتوں اور اُن کے لیڈروں کی بھی ہے، اور یہ ضرورت سب سے بڑھ کر خود فوجی حکمرانوں کی بھی ہے۔

پھر اگر یہ بات سمجھ میں آجائے کہ صرف انتخابات کا انعقاد ہی مطلوب نہیں، بلکہ اچھی مصالحت پسندانہ اور صحت مندانہ فضا بھی ان کے انعقاد کے لیے ضروری ہے تو پھر طریق کار یہ نہیں چل سکتا کہ ایوانِ اقتدار جو بھی فیصلہ مناسب سمجھے گا کر دے گا۔ دوسرے فریق یعنی عوام اور اُن کی رہنمائی کرنے والے اہل سیاست سے ہم آہنگی لازمی ہو گی۔

اس وقت اہلِ سیاست کا زور اس بات پر ہے کہ انتخابات جلد ہونے چاہئیں۔ اور خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ملک کی زیادہ مؤثر قوتوں کا متحدہ مطالبہ یہی ہے۔ یہ مطالبہ جلد پورا کرنے کا حتمی اور یقینی اعلان ہو جائے اور اس کے لیے مشینری بن جائے تو وہ تمام ہنگامے ختم ہو جاتے ہیں جو بحالی جمہوریت اور انعقادِ انتخابات کے لیے بعض عناصر نے برپا کیے، نیز وہ ہنگامے بھی ختم ہو جاتے ہیں جو سطح سمندر سے بہت نیچے پرورش پا رہے ہیں اور کچھ اور وقت اگر تاخیر و التوا میں گذارا گیا تو وہ بھی سفینۂ ملت کے گرد رقصندہ ہو سکتے ہیں۔

ایک اور اصولی بات یہ ہے کہ انتخابات لازماً جداگانہ بنیادوں پر ہونے ہیں جن کا نہایت

مفید تجربہ ہو چکا ہے۔ اقلیتوں کی سیٹیں بھی محفوظ، اور کوئی اکثریتی نمائندہ بھی کسی اقلیت کے مخصوص مطالبوں (اور خصوصاً خلاف اسلام رجحانات) کے دباؤ میں پسنے سے سلامت۔

لیکن قادیانیوں کے متعلق روش اب تک اُلجھی ہوئی ہے۔ اُن کے ملازمین، ان کے افسروں (اور مختلف گریڈوں اور کلیدی عہدوں پر فائز اشخاص) کا سروے مکمل طور پر ہونا چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ یہ لوگ کس تناسب سے ہم پر مسلط ہیں۔ سول آبادی میں بھی اِن کی فہرست ووٹراں الگ بننی چاہیے، بلکہ دوسری اقلیتوں کے ساتھ جو "قادیانی ووٹر" مسلمان کے نام سے ووٹ ڈالنے آئے، پولنگ ایجنٹوں کا کام ہے کہ وہ پہلے سے ایسے قادیانیوں پر گرفت کرنے کے لیے تیار رہیں اور ضروری ثبوت مہیا رکھیں۔ علی الخصوص اُمیدواروں کے لیے اگر کوئی درخواست اس گروہ کی طرف سے مسلم تشست کے لیے سامنے آئے تو جانچ پڑتال کے وقت پورے ثبوت اور شہادتوں سے اس کو ناجائز ثابت کیا جائے۔

تیسری گذارش یہ کہ کالعدم جماعتوں کی اکثریت نے بھی اور اخبارات میں لکھنے اور اسٹیجوں سے بولنے والے دوسرے دانشوروں اور قومی اُمور پر کلام کرنے والوں نے بھی زیادہ تر اس امر پر زور دیا ہے کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔

ترجمان القرآن ہی میں چند ہی ماہ پہلے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ "سیاسی جماعتوں" کی ضرورت و اہمیت کیا ہے۔ مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ میرے لکھے کو ہر کوئی پڑھے اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ لوگ پڑھیں جن کو کارپرداز کہتے ہیں، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر عالم بالا کے حضرات پڑھیں بھی تو کبھی غور کریں اور کسی چیز کو پُرافادیت پائیں تو اس کا اعتراف کریں اور جب عملی نقشہ بنانے لگیں تو کسی مفید بات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت بھی انہیں محسوس ہو۔

میں ایک بار پھر یہ بات دوہرانا چاہتا ہوں کہ سیاسی جماعتیں کن کن صورتوں میں معاشرے اور اُس کی حکومت اور انتخابی و پارلیمانی سرگرمیوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں:

۱ — سیاسی جماعتوں میں سے ہر ایک اپنے گرد بہت سے ایسے افراد کو جمع کرتی ہے جو ایک طرزِ فکر پر متحد ہو جائیں اور فرد فرد اپنی اپنی الگ سوچ بچار میں سرمست نہیں رہتا۔

۲ — عوام کی سیاسی جماعتیں منظم رہنا اور منظم ہو کر کام کرنا سکھاتی ہیں اور چند سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کا کسی معاملے میں اطمینان تمام جمہور کو مطمئن کر دیتا ہے اور ان کا اضطراب سب کو مضطرب کرنے کا باعث بنتا ہے۔

۳ — سیاسی جماعتیں اپنے پیروکاروں کو ملکی مسائل سے آگاہ کرتی ہیں، اُن کو احساس دلاتی ہیں کہ ہماری داخلی اور خارجی ضروریات کیا ہیں، ان کو ایک منشور پر جمع کرتی ہیں۔ اُن کو پورے مُلک کی محبت کی تعلیم دیتی ہیں۔ اُن کو اسلامی دین و تہذیب اور اس کی قدروں کا شعور دلاتی ہیں، اُن کو اُن کی تاریخ سے آگاہ کرتی ہیں، اُن کے سامنے ان کے اکابر و اعاظم کی زندگیوں کو نمایاں کرتی ہیں اور مختلف طریقوں سے اُن کی تربیت کرتی ہیں۔

۴ — سیاسی جماعتیں جس طرح کسی ناخوشگوار صورتِ حالات میں عوام میں گرما گرمی کی کیفیت پیدا کر سکتی ہیں، اسی طرح وہ اُن کو کسی مقصد کے لیے قربانی دینے اور کسی زیادتی پر صبر کرنے پر بھی تیار کرتی ہیں۔

۵ — سیاسی جماعتیں ہی برادریوں، علاقوں اور زبانوں کی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر عوام کو مُلک و ملت کے لیے کام کرنے کا راستہ دکھاتی ہیں۔ سیاسی جماعتیں نہ ہوں تو پھر عصبیتوں کی بنا پر تفرقہ پردازیاں وجود میں آتی ہیں۔

۶ — سیاسی جماعتیں اس امر کا ذریعہ ہوتی ہیں کہ عوام اپنی شکایات اور مطالبات بلا کسی رکاوٹ کے اُن کے سامنے لائیں، اور پھر ان جماعتوں کے لیڈروں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ہر مصدقہ اور قابلِ اعتماد شکایت کے ازالے یا ضرورت کی تکمیل کے لیے پارلیمانی ایوانوں یا وزارتی دفتروں یا دیگر اداروں تک بات پہنچائیں۔

۷ — یہ کام بھی سیاسی جماعتیں ہی کر سکتی ہیں کہ حکومت جو صحیح پالیسی طے کرے یا مفید قانون بنائے اسے سیاسی کارکن گلی گلی، اپنے اپنے حلقۂ اثر میں واضح کریں اور اس کی ضرورت اور افادیت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ بلکہ یوں بھی ہوتا ہے کہ جو اقدام ہونے لگا (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) ہوتا ہے۔ فرماں روا سیاسی جماعت کے لیڈر اور کارکن پہلے سے اس کے لیے فضا بنانے لگتے ہیں۔ اور اعتراضات کو صاف کر دیتے ہیں۔

۸ — سیاسی جماعتیں اپنے ہزارہا کارکنوں کی ٹیموں کے ذریعے ملک بھر کے تمام علاقوں اور بستیوں کے حالات کی رپورٹیں آسانی سے جمع کر لیتی ہیں۔ پھر ان معلومات کی بنیاد پر معاملات کو صحیح طور پر سمجھنا اور فیصلے کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

۹ — سیاسی جماعتوں سے کارکنوں کی وابستگی ہی اُن کو مختلف اُمیدواروں کی رشوتیں قبول کرنے سے روکتی ہے۔ اور وہ اپنی پارٹی کا جھنڈا بلند رکھنے کے لیے پاس سے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یقیناً اس تعریف سے مستثنیٰ تعداد بھی موجود رہتی ہے۔ مگر وہ اس وجہ سے ہے کہ نہ تو انتخابی تربیت پوری طرح ملی ہے اور نہ بدعنوانیوں کے خاتمے کے لیے بھرپور قانونی کارروائیاں ہوتی رہی ہیں۔

اِن حقائق کو سامنے رکھیں تو غیر جماعتی انتخابات کا تصور بھی نہ لائیں۔ غیر جماعتی انتخابات جن میں فرد فرد الگ الگ ہوگا، ایک تو چھوٹے چھوٹے دائروں کی عصبیتیں زیادہ کام کریں گی، نظریۂ پاکستان اور اسلامی خدمات درمیان میں سے غائب ہو جائیں گے، ووٹروں کے ضمیر رشوت کے زہر سے مُردہ ہو جائیں گے۔ کسی اُمیدوار اور ووٹر کے سامنے کوئی ملک گیر مقصد نہ ہوگا کوئی اسلامی نصب العین نہ ہوگا، ہماری وحدت کے تمام قیمتی بندھن ٹوٹ جائیں گے۔

پس فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ انتخابات ہوں گے، جلد ہوں گے، جداگانہ ہوں گے اور جماعتوں کے ذریعے ہوں گے۔

"سیاسی جماعتوں" کے بارے میں ہمارے بزرگ و دانشور خادمِ ملت مولانا ظفر احمد انصاری کی چیئرمینی میں کام کرنے والے انصاری کمیشن میں جو منفی رپورٹ شریعت کے نام سے دی ہے" اُسے اگر اجتہاد بھی کہا جائے تو بڑا تباہ کن اجتہاد ہے۔ اس مبحث پر دو بہت اچھے مقالات روزنامہ جسارت میں آچکے ہیں، ایک مولانا محمد ناظم ندوی کا، دوسرا جناب صلاح الدین صاحب کا۔

تمام ضروری باتیں مدلّل طور پر ان میں بیان ہوگئی ہیں۔ ان کے ملخص کے طور پر ہی میں یہاں چند اجمالی نکات عرض کر رہا ہوں۔

۱۔ اوّلین امر جو نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل رہا ہے وہ یہ ہے کہ قرونِ اُولیٰ کی مسلم سوسائٹی (خصوصاً عہدِ سعادت) آج اس شکل میں موجود نہیں، بلکہ ایک زوال زدہ معاشرہ ہمارے سامنے ہے۔ وہاں فرد فرد کو پہلے دن سے حقیقت دین و سیاست کا درس دیا گیا اور بیچ میں مسلسل اخلاقی شعور اس میں پیدا کیا گیا۔ ایسے افراد اپنا انتظام جس طور پر بھی چلائیں وہ اچھے نتائج کے ساتھ چلنا چاہیے اور چلا۔ دوسرے اس اسلامی معاشرے کو خدا کے رسولؐ کی قیادت حاصل تھی جس پر سو فیصد ایمان و اعتماد ہر فرد کو تھا۔ تیسرے وہ معاشرہ ایک مختصر آبادی کی منظم طاقت سے وجود میں آیا تھا۔ جب کہ آج کروڑوں افراد پر ایک ایک قوم مشتمل ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ لوگ ایک ایسی انقلابی کشاکش سے گذرے اور مسلسل گذرتے رہے۔ جس نے اُن کے اندر سے ان کے صحیح لیڈروں کو خود ہی اُبھار دیا تھا۔ پانچویں یہ کہ وہاں کی مسلم آبادی قبائلی وحدتوں میں منظم تھی اور قبیلوں کے متعلق فیصلے اور معاہدات سردارانِ قبائل ہی کر لیتے تھے۔ آج یہ تنظیمی یونٹ موجود نہیں ہے۔ اس کا خلا کس طرح پورا ہوگا۔

آج جس معاشرے میں یہ سارے احوال نہ ہوں اس میں کام چلانے کے لیے کچھ دوسری (جائز) تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اجتہادات اس معاشرے کو سامنے رکھ کر کیجیے نہ کہ دورِ سعادت کے معاشرے کے لحاظ سے۔

۲۔ آپ نے یہ تو فرمایا کہ سیاسی جماعتیں نہ ہونی چاہئیں کیونکہ پوری ملت ایک جماعت ہے۔ عرض یہ ہے کہ عملاً اس ملت کو ایک ملت کی حیثیت سے سامنے لاکے دکھایئے۔ پاکستان کو تو چھوڑیئے، کیا صرف کراچی کو آپ ایک منظم یونٹ بنا سکتے ہیں۔ پس جب یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ پوری ملت ایک منظم جماعت ہے تو اس بنیاد پر جو اجتہاد کھڑا کیا جائے گا وہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔

۳۔ آج ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں، اس میں بھی بہت سے منظم گروہ ہیں۔ پیپلز پارٹی

ایک منظم جماعت ہے، مغرب زدہ خواتین کی تنظیمیں اپنا کام کر رہی ہیں، سیکولر نقطۂ نظر کے لوگ اپنی حلقہ بندیاں رکھتے ہیں، ادب کی تنظیمیں ہیں، صحافت کی ہیں، مزدوروں کی یونینز ہیں، وکلا کی انجمنیں ہیں، ایوان ہائے تجارت ہیں، مذہبی طور پر خانقاہی نظام بھی ہے، پیری مریدی کی تنظیمیں بھی ہیں، تبلیغی جماعت کا نظام بھی ہے، منکرینِ حدیث کا ادارہ بھی ہے۔ قرآن کے لیے کام کرنے والے منظم حلقے بھی ہیں، دیوبندی اور بریلوی اور وہابی اور شیعہ تنظیمیں بھی ہیں۔ اگر یہ ساری جماعت بندیاں وحدت ملت کے اصول کے باوجود برسرعمل ہیں تو آخر ایک سیاسی ضرورت ہی سے نظم بندی کیوں ناجائز ہے۔

۴ — آپ کہتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کے میدان انتخابات میں آنے سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جب آپ ہر ہر فرد کو ایک الگ جماعت (قائم مقام) بنا دیں گے، تو پھر خرابیاں کس درجہ کی ہوں گی۔ ہر خیال اور ہر فکر اور ہر رنگ کے افراد کو جب آپ چھوٹ دے دیں گے تو الیکشن افسروں کے لیے بھی اور ووٹروں کے لیے بھی اُن کو جاننا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ اب تو لوگ آسانی سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ فلاں آدمی مسلم لیگ کا ہے تو وہ اِس اِس طرزِ فکر کا ہوگا، جمعیت العلماء کا ہے تو ایسا ایسا ہوگا، تحریکِ استقلال یا این اے پی سے متعلق ہے تو اس کے خیالات و مقاصد فلاں فلاں ہوں گے۔ پیپلز پارٹی کا ہے تو اس کا فسطائی ذہن یوں یوں کام کرتا ہوگا، جماعتِ اسلامی کا ہے تو اس کے خیالات اور اس کا پروگرام اِس اِس انداز کے ہوں گے۔

آپ اگر سب کو فرد فرد کر کے انتخابی "پریشر ککر" میں اکٹھا ہی ڈال دیں گے تو ووٹنگ کی آنچ سے پک پکا کر نکلے گا کیا؟

۵ — ہم اپنے محترم بزرگ اور اُن کے کمیشن کے ارکان سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نقطۂ نظر کو سمجھیں کہ ایک معاشرہ جس کا دَور زوال اور دَور غلامی کے بعد وحدتِ ملت کا (حقیقی، عملی اور اخلاقی) بندھن ٹوٹا ہوا ہو، اُسے منظم ملت بنانے کے لیے اور کوئی راستہ ہی اس کے سوا نہیں ہے کہ جس خدا کے بندے کو صلاحیت و توفیق اللہ نے دی ہے، وہ دین کے اُصولوں اور پاکیزہ سیاست کے شعور پر ایک ایک فرد کو جمع کرے اور آہستہ آہستہ اس کوشش

کو تو سبیع ملے۔ کوئی دوسرا شخص نیک نیتی سے اگر کسی دوسرے طریق کار کو بہتر سمجھتا ہو تو وہ جماعت بندی کرے۔ اس طرح کی جماعت بندیوں میں سے بعض ختم ہو جائیں گی، بعض متوازی طور پر کام کریں گی، بعض آگے کسی سطح پر ایک ہو جائیں گی، اور بعض کو باہمی تصادم تراش خراش سے گذار کر کسی ایک قوت کو ابھار دے گا۔ ایسی کوششوں کے نتیجے میں ملت میں نظم پیدا ہو سکتا ہے۔ ورنہ فرد فرد کو بھیڑ بکریوں کی طرح رہنے دیجیے، کوئی گڈریا منہ میں بانسری لیے اور کندھے پر لاٹھی رکھے انہیں جدھر چاہے گا ہانکتا رہے گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ بھی سیاسی پارٹیاں ہیں جو اپنے گرد جمع ہونے والوں کی سیاسی تربیت کرتی ہیں، مسائل کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں، رائے دہی کے قابل بناتی ہیں، دستور اور پارلیمانی قواعد سمجھاتی ہیں، مشاورت باہمی کے طور طریقوں کی عملی تعلیم دیتی ہیں۔ ڈسپلن میں رہ کر کام کرنے کی خصوصیت پیدا کرتی ہیں۔ یہ اہتمام اگر نہ ہو تو پھر کون سی یونیورسٹی یا کالج یا انسٹی ٹیوٹ آپ کے پاس ایسا ہے جو کروڑوں کی آبادی کو یہ تربیت دے سکے۔

۶ ــــ جس دین میں جماعت بندی کی تعلیم یہ رہی ہو کہ اگر دو مسافر ہوں تو ایک امیر کارواں ہوگا اگر دو نمازی ہوں تو ایک امام ہوگا، حج کے لیے نکلو تو ایک امیر حج ہوگا، گھر کی زندگی ہو تو ایک قوام ہوگا، اس کے متعلق یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ لوگ گروہ در گروہ ووٹ دینے نکلیں اور کوئی اُن کا سربراہ نہ ہو۔ یا کچھ لوگ اُمیدوار بن کے اُٹھیں اور کوئی ان کا ذمہ دار نہ ہو، یا کچھ لوگ پارلیمانی ایوانوں کی کارروائی میں حصہ لیں اور کوئی اُن کا انسٹرکٹر نہ ہو۔ کسی مسلمان کے لیے ایسی غیر جماعتی زندگی کسی بھی دائرے میں قابلِ قبول نہیں۔

فوج منظم، کیبنٹ منظم، انصاری کمیشن منظم، ادارۂ تحقیقات اسلامی منظم، عدالتیں منظم، بیوروکریسی دفتر در دفتر منظم، لے دے کے ایک سیاسی نظم بندی شریعت کی زد میں آتی ہے؟ پھر سوچیے۔

ہمارے خیال میں عین شرعی تقاضوں کے تحت افراد کو سیاست یا انتخابات میں لینے کے لیے منظم ہونا چاہیے ــــ معیاری صورت یہ کہ سارے پاکستان میں تمام آبادی کو

ایک ہی جماعت میں، اور یہ حاصل نہ ہو تو کم سے کم مختلف صحیح المقاصد قیادتوں کے تحت۔

ایک اہم مسئلہ متناسب نمائندگی کا ہے[1]۔

یہ طریق انتخاب نہ صرف یہ کہ یورپ کی متعدد ریاستوں میں رائج ہے، بلکہ اب تو برطانیہ کی انتخابی سیاست بھی اسی رُخ جا رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقہ سخت غیر منصفانہ اور خود رُوحِ جمہوریت کے خلاف ہے۔ مثلاً ۴ امیدواروں میں سے ایک ۱۰٪ ووٹ لیتا ہے، دوسرا ۲۰٪، تیسرا ۳۰٪، چوتھا ۴۰٪۔ اب ۴۰ فیصد ووٹ لینے والا کامیاب قرار پایا اور ۶۰ فیصد ووٹ جو دراصل اُس کامیاب شخص کے خلاف پڑے ہیں وہ بالکل بے معنی قرار پاتے ہیں بلکہ اور کئی صورتیں ہیں جن میں ۲۷ فیصد ووٹ لینے والا اُمیدوار ۷۳ فیصد مخالف ووٹروں کے علی الرغم بازی مار لے جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اس طریقِ انتخاب کی اور کئی خوبیاں ہیں:

۱۔ حلقۂ انتخاب پورا ملک ہو، صوبہ ہو، کمشنری ہو یا ضلع، کسی خیال کے ووٹر کا ووٹ ضائع نہیں جاتا۔ جس تناسب سے ووٹ مختلف جماعتوں کو ملیں گے، اُسی تناسب سے ان کی پیش کردہ لسٹوں میں سے نمائندے لے لیے جائیں گے۔ اس طریقے میں کوئی امکان نہیں کہ ملک بھر میں مجموعی طور پر ۳۵٪ یا ۲۷٪ ووٹ لے کر کوئی جماعت اقتدار کی کرسی پر جا بیٹھے۔

۲۔ ووٹروں کی اصل توجہ جماعتوں کے اُصولوں، مقاصد اور اُن کے منشوروں پر مرتکز

---

[1] متناسب نمائندگی کی مختلف تفصیلی اشکال سے قطع نظر خلاصہ یہ ہے کہ ہر باضابطہ جماعت یا پارٹی ملک یا صوبے یا ضلعے (جو بھی حلقۂ انتخاب ہو) کی مقررہ سیٹوں کے لیے اتنے ہی (یا کم) نمائندوں کی فہرست پہلے سے داخل کر دیتی ہے۔ پھر کل حلقۂ انتخاب میں جتنے ووٹ کسی پارٹی کو ملتے ہیں ان کے تناسب سے اس کی لسٹ میں سے افراد لے لیے جاتے ہیں۔ اس طرح ووٹ ضائع نہیں جاتے اور نہ اقلیتی ووٹوں کے بل پر کوئی فرد یا جماعت انتخاب سر کر سکتی ہے۔

ہوتی ہے، افراد کی لسٹ کو ثانوی طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کس میں کتنی اور کیا قابلیتیں ہیں۔ اسی طرح جمہور کی نگاہ چھوٹے چھوٹے ذاتی یا مقامی یا علاقائی مفاد سے اونچی اٹھ کر بڑے بڑے ملکی مفاد پر مرتکز ہونے لگتی ہے۔

۳ — برادری پرستوں، علاقہ پرستوں اور نسل پرستوں کے خود ساختہ طلسم ٹوٹ جاتے ہیں۔

۴ — اُمیدوار افراد اپنی اپنی ذاتی کامیابی کے لیے محدود حلقۂ انتخاب میں جس طرح روپیہ دے کر ضمیر خریدتے، ڈراتے دھمکاتے، فساد کراتے اور طرح طرح کی بدعنوانیاں ایجاد کرتے ہیں۔ اور سارے معاشرے میں مستقل طور پر کرپشن پھیلا دیتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ متناسب نمائندگی کی شکل میں باقی نہیں رہتا۔ متفرق افراد کے بجائے سارا عمل منظم جماعتوں کے ذریعے مکمل ہوتا ہے۔

۵ — سارے ملک یا جتنا بھی حلقۂ انتخاب مقرر کیا جائے، اس کے لیے فہرستیں پیش کر کے مقابلے میں آنے والی جماعتوں کے حساب سے ووٹ کارڈ میں چند نشانات مقرر کرنے ہوں گے یعنی کام میں بہت سادگی اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ بلکہ ملک بھر میں ایک پارٹی کے لیے ایک رنگ یا نشان مقرر ہو جانا چاہیے۔

۶ — جماعتوں کی پیش کردہ لسٹوں کی جانچ پڑتال یک جائی ہو سکتی ہے، اور خاص خاص مقررہ شرائط اور پابندیوں کے معیار پر اُن کو پرکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل ذمہ داری پارٹیوں کی ہو گی، ان کو پہلے سے لازمی اصول و معیار برائے نمائندگان دے دیئے جائیں گے کہ وہ اُن کے مطابق لسٹ میں نمائندے شامل کریں اور جب بھی کسی کامیاب رکن کے خلاف کوئی صورتِ واقعہ سامنے آجائے گی۔ جس کی گنجائش قانون انتخابات میں نہ ہو تو اُسے الگ کر کے اس کی جگہ لسٹ میں بعد کے کسی نمبر کے آدمی کو لے لیا جائے گا۔ اور الگ ہونے والے شخص کے خلاف پارلیمانی یا عدالتی کسی بھی قسم کی کارروائی الگ ہوتی رہے گی۔

یعنی اس طریقِ کار میں ضمنی انتخابات کے مصارف و انتظامات سے حکومت بری الذمہ ہو جائے گی۔

۷ — سرمایہ دار، صنعت کار اور وڈیرے یقیناً جماعتوں کے اندر بھی گھسیں گے اور

اپنے آدمیوں کو بھی روپے کے زور سے لسٹوں میں شامل کرانے کی کوشش کریں گے، مگر ان لوگوں کے لیے فرداً فرداً خاص ہتھکنڈوں سے انتخابی جنگ لڑنے کا راستہ بند ہو جائے گا۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پارٹیوں کو اہمیت ملنے کے بعد اُن کی قوت و اثر میں کمی آجائے گی اور آہستہ آہستہ متفرق افراد کے آگے آنے کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔

اس طریق انتخاب پر دو ہی اعتراض کیے جاتے ہیں:۔

ا۔ ایک یہ کہ اس طرح ایک کولیشن حکومت تو بن سکتی ہے مگر کسی ایک پارٹی کی اکثریت نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے، مگر سوائے دھاندلی کے اور کسی بھی طرح موجودہ ماحول میں کوئی ایک پارٹی اکثریت نہیں حاصل کر سکتی۔ عام طریق انتخاب کے تحت بھی اہم پارٹیاں مل کر حکومت بنائیں گی۔ یا اُن کا کوئی متحدہ محاذ کامیاب ہو کر نظام کو چلائے گا۔ اور اس وقت کے بحرانی حالات کی پیچیدگیاں ہیں بھی ایسی کہ ضرورت ایک متحدہ مخلوط حکومت ہی کی ہے تاکہ ساری قوتیں مل کر ناسازگار احوال کا مقابلہ کریں۔ آگے چل کے ایسا موقع بھی آسکتا ہے کہ کسی ایک پارٹی کو ملک بھر میں اکثریتی ووٹ حاصل ہو جائیں۔

ب۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ تناسب نمائندگی کی صورت میں آزاد نمائندوں کے لیے کام کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات وہ پارٹیوں کے پابند افراد سے زیادہ بہتر کام کر دکھاتے ہیں۔ اس کا اوّلین جواب تو یہ ہے کہ آج تک کہ تاریخ تو اس کی گواہ ہے کہ آزاد حضرات ایوان میں جا کر بہترین بکاؤ مال ہوتے ہیں یا بہتر خریدار کہ جدھر ان کا سودا ٹھیک بیٹھ جائے، وہ اُدھر کے ہو جاتے ہیں۔ بہت سے آزاد اُمیدوار کچھ دوسرے حلقوں کے سامعین کے ساتھ مل کر پروگرام بناتے ہیں اور پھر اپنی چند نفری متحدہ قوت کو روپے کی تقسیم اور مفاد رسانی کے حربے سے کئی افراد کو اِدھر اُدھر سے توڑتے اور بسا اوقات وزارتوں تک مار کر لیتے ہیں۔ قوم کے لیے بہتر یہ ہے کہ اس پارلیمانی کرپشن سے اُسے نجات مل جائے جس کا بہترین طریقہ تناسب نمائندگی کا طریقہ ہے۔ ہاں آزاد حضرات یہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک پارٹی میں ڈھالیں اور اس کا کوئی ضابطہ و منشور بنائیں، اس کی مناسب حد تک ممبر شپ ہو اور اس میں انتخابی عمل کام کرے۔ وہ رجسٹریشن حاصل

کریں۔ وہ اپنی جماعت کو "آزاد نمائندوں کی جماعت یا گروپ" ہی قرار دے لیں۔
پس یہ دو اعتراضات ایسے نہیں جن کی وجہ سے متناسب نمائندگی کی خوبیاں بے معنی ہو جائیں۔

سننے میں نت نئی باتیں آتی ہیں اور کسی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی ثقاہت کیسی ہے۔ مثلاً ایک یہ افواہ اُوپر سے آئی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ متناسب نمائندگی کا تجربہ ہر ضلع کو ایک حلقۂ انتخاب بنا کر کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے قدم اور تجربے کے طور پر یہ صورت بھی اچھی ہے۔ تاہم بعض ضلعوں یا ضلعوں کے خاص خاص بڑے بڑے علاقوں (اور مزارعوں) پر بعض لوگوں کے خصوصی اثرات ایسے ہیں کہ اُن کو کام میں لا کر ضلع کی مختصر سی فہرست میں جگہ پا کر بآسانی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے صیادانِ مناصب کے اثر و نفوذ کو بالواسطہ طور پر ختم کرنا ایک مقصد ہونا چاہیے۔ بعض جماعتیں جن کا دار مدار اس طرح کی علاقائی با اثر شخصیتوں (خصوصاً زمینداروں، صنعت کاروں اور وڈیروں) پر ہوتا ہے وہ بھی اغلباً ضلع کی سطح کو پسند کر لیں۔ ضلع کی حد تک ووٹوں کی بڑی بڑی چند منڈیوں (PRESSURE GROUPS) کے سیٹھوں کو خریدنا مشکل نہیں ہوتا اور خاندانوں برادریوں کی قوت کو بھی حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ترجیحاً ملک اور ثانوی حد تک صوبہ اگر حلقۂ انتخاب بنے تو پھر بعض با اثر اور دولت کے لالچ اور جرائم و تشدد کی تحریب سے کام لینے والے اصحاب بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

پھر بھی ایک درمیانی صورت ہے کہ کمشنری کو بنیادی حلقہ قرار دیا جائے۔ مقصود نہ صرف حالیہ یا آئندہ کے انتخابات کی آسانیاں ہوں، بلکہ آہستہ آہستہ کمشنری کو زیادہ سے زیادہ قوت و اختیار کا مرکز بنایا جائے۔ صوبوں کے نظام کو مختصر شکل دے کر عارضی طور پر محض نگرانی اور ہم آہنگی کے لیے برقرار رکھا جائے۔ اس طرح ایک تو "پنجاب" کے خلاف جو شکایات اُٹھائی جاتی رہتی ہیں ان کا ازالہ کرنا ممکن ہے۔ چھوٹے بڑے سارے صوبوں میں معاملات کمشنری کی سطح پر آ جائیں گے اور بے شمار لیڈرز اور کارکنوں کو بہت قریب دائرہ ہائے کار مل جائیں گے

بلکہ عوام کے زیادہ سے زیادہ مسائل کا حل اس سطح پر چلا جائے گا۔

پاکستان میں لیڈری کا حصول ہے بھی مشکل۔ پھر اس کی ضرورت بھی محدود ہو جائے گی اور ملکی یا وفاقی سطح پر لیڈری کی حیثیت حاصل کرنے والے خاص خاص اہل افراد ہی آگے آئیں گے۔ یہ ممکن نہ رہے گا کہ دس دس، پچاس پچاس افراد کو ساتھ لے کر کچھ سیاسی اکابر ایک پارٹی کی حیثیت سے میدان میں آجائیں۔ پارٹی کے لیے ملک گیر ہونا لازمی ہوگا۔ اور انتخابات کے انعقاد سے ایک خاص مقررہ مدت پہلے سے اس کا وجود اچھی طرح متعارف ہونا چاہیے۔

متناسب نمائندگی کے ساتھ سیاست اور لیڈری کو کمشنری کے دائرے میں لے جانے سے ہماری وہ بہت سی اُلجھنیں حل ہو سکتی ہیں جو آج کی سیاست میں موجود ہے اور بالکل ابتداء سے نشوونما پاتی رہی ہیں۔ علیٰحدگی پسندی کے رجحانات کے لیے بھی فضا ناسازگار ہو جائے گی۔

یہ ایسے مسائل میں سے ایک ہے جسے ہمارے مخلص مدبّرین (اگر وہ اُوپر پائے جاتے ہوں) کو سر جوڑ کر پوری دماغ سوزی کے ساتھ سوچنا چاہیے۔ پاکستان کے تصور کے بعد شاید یہ اہم ترین تخیل ہے جو ہمارے ملکی اور علاقائی در و بست کو بہتر شکل دے سکتا ہے۔

جلد انتخابات ——— جماعتی انتخابات ——— جداگانہ انتخابات ——— متناسب نمائندگی کے اُصول پر انتخابات!

ملک و ملت کے لیے یہ بہترین راستہ ہے۔